باب ۶

سالارِ زماں

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ
النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًاo

قوم کی رُوح

سائنس کے نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو کسی قوم کی بڑائی کا سبب اس کا وہ نصب العین ہوتا ہے جس میں دائمی اقدار ہوں۔ اور جن کے حصول کے لئے وہ عزم وحوصلہ سے ایک مسلسل جدوجہد میں لگی ہوئی ہو۔ یہی نصب العین اس قوم کی بقاء، ارتقاء اور عروج کا ضامن ہوتا ہے۔ تاریخ کے ورق پلٹیں تو اس دنیا میں بڑی بڑی قومیں اپنی تہذیب اور عمرانیت کو لے کر نمودار ہوئیں، کچھ عرصے دنیا میں رہیں اور پھر ختم ہوگئیں۔ بڑی بڑی مہذب قوموں کا یہ حال ہوا کہ ان میں سے کچھ صفحہ ہستی سے ایسی غائب ہوئیں کہ اس دنیا میں اپنا نشان تک نہ چھوڑا اور صرف آثار قدیمہ کی تحقیقات کی زینت بن کر رہ گئیں۔قوموں ہی کا کیا، جانوروں کے وجود تک کو اس سطح ارض پر دیکھا جائے تو ان میں بھی ایسی ایسی نسلیں اور اقسام آئیں جن کا شاندار دور دورہ رہا مگر پھر قدرت کے ہاتھوں مٹ گئیں۔ الغرض تمام کی تمام انسانی، حیوانی اور نباتاتی زندگی کی بقاء، ارتقاء اور تنزل کا جائزہ لیا جائے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ زندگی اور قدرت کے کچھ ایسے ہی فطری تقاضے اور نظریے ہیں جن سے نسل انسانی وحیوانی اور قوموں کو پائیدار اقدار نصیب ہوتی ہیں اور ان کی زندگی کو ان کے سہارے ایک طویل عرصے تک بقا حاصل ہوتی ہے۔

پرانے دانش وروں کا کہنا ہے کہ جیسے ایک فرد کی روح ہوتی ہے جو اس کے جسم میں ہوتے ہوئے اس کی اِرتقا کا باعث بنتی ہے اور ایک عمرِ طبعی تک، جسے ستر ۷۰ یا سو سال کہہ لیں، اس کے جسم میں رہتی ہے، اسی طرح ہر قوم کی ایک رُوح ہوتی ہے جس کی عمر اندازاً ہزار سال ہوتی ہے۔ تاریخ بھی اس نظریے کی تصدیق کرتی ہے کہ عام طور پر بہت سی تہذیبوں نے یہی ہزار سال تک یا اس سے کچھ کم یا زیادہ، اپنے اثرات زمانے میں چھوڑے

ہیں۔ افراد پیدا ہوتے ہیں اور اس دنیا میں زندگی گزارتے ہیں لیکن جو چیز چھوڑ جاتے ہیں وہ ان کی تہذیب ہے۔ اسی تہذیب کی ضِمنی شکلیں اِقتصادی خوش حالی، تہذیب کی بُلندی، رہنے سہنے کا اعلیٰ معیار، طاقت وعظمت وغیرہ کے نشانات ہوتے ہیں۔ مگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو ان میں سے نصبُ العین، یعنی اِقتصادی خوش حالی، اعلیٰ معیارِ زندگی، تہذیب، عظمت وشوکت وغیرہ سب کی سب ناپائیدار اقدار ہیں، آنی جانی چیزیں ہیں اور ان کو دوام نہیں۔ اسی لئے جن قوموں نے اپنا نصبُ العین ان ہی ظاہری اور جھوٹی چمک والی اقدار کو بنالیا وہ ختم ہوگئیں۔ ان اقدار کو اپنا نصب العین بنالینا ہی ان قوموں کی تباہی کے لئے کافی تھا کیونکہ نہ مال و دولت، نہ قُوت وعظمت، نہ فنونِ لطیفہ و ادب، کسی قوم کی سربُلندی، ارتقاء اور دوام کے ضامن ہو سکتے تھے۔ ظاہر کے اس قسم کے تمام عروجوں کا نتیجہ یہی ہوتا رہا کہ باطن، جس کو دوام ہے اور بھی کمزور ہوتا چلا گیا اور ان قوموں کی قوتِ حیات اور ناپائیدار ہوتی چلی گئی۔ فنونِ لطیفہ، ادب، فلسفہ، بذاتِ خود کسی قوم کی بنیادی صفات مظبوط نہیں کرتے۔ نہ اس تہذیب کی نشاندہی کرتے ہیں، نہ اس کو حیات کی ضمانت دیتے ہیں، البتہ ان کے ذریعے اس قوم کا نظریہ معلوم ہو سکتا ہے۔ اور اس دنیا میں اس قوم کے حصول، کامیابیوں اور ناکامیوں کا اندازہ لگایا جاستا ہے۔

انسانی جسم کے اِرتقا کو دیکھا جائے تو یہ اندازہ کرلینا مشکل نہیں کہ جسمانی طور پر انسان کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا جارہا ہے۔ مگر اس کے ذہن اور عقل کی قوت لگاتار بڑھتی چلی جارہی ہے۔ انسانی ذہن کے اِرتقائی عروج کے صلے میں یہ ضرور ہوا ہے کہ صدیوں کی کشمکش کے بعد انسان نے اجتماعی عمل اور مل جل کر کام کرنے کی قدروقیمت جان لی ہے۔ آثارِ قدیمہ کے محققین ہمیں بتاتے ہیں کہ تقریباً پچاس ہزار سال قبل پہلا معاشرتی گروہ وجود میں آیا۔ اس وقت تک انسان نے تنہائی اور چھوٹے گروہ کی کمزوری کا اندازہ کرلیا تھا۔ اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ تسلسلِ حیات کے لئے خاندان اور قبیلے ضروری ہیں۔ اس کے بعد انسان نے اجتماعی زندگی گزارنا اپنے لئے مفید سمجھا۔ اور گاؤں اور شہروں نے اس طرح جنم لیا۔ انسانی ذہن کی اسی اِرتقائی ترقی کا اصل سبب دیکھیں تو اس کی بنیادی وجہ اپنی حفاظت اور نسل کی بقا کا شعور تھا جس نے جمعیت کی طرف اس کا قدم اٹھایا۔ افراد کو فنا تھی مگر جمعیت کو بقا۔

حیاتِ انسانی کی بقا کو دیکھا جائے تو اس کے دو پہلو ہیں، ایک منفی اور ایک مُثبت۔ منفی پہلو یہ ہے کہ قدرت کی تباہ کرنے والی قوتوں کے مقابلے میں بقاء کی تلاش ہے۔ اس میں بُھوک، بیماری، خطرات، ناگہانی حادثات، قحط، سیلاب، طُوفان، موسم، آتش فِشاں پہاڑوں کا پھٹنا وغیرہ ہیں جن سے انسان کو مقابلہ کرنا ہے۔ صدیوں کی پیہم کوشش سے اب کہیں انسان تہذیب کی ترقی کے اس مقام پر آیا ہے کہ بقاء کے ان منفی پہلوؤں سے اس نے نجات پالی ہے۔ لیکن صرف اطمینان اور سکون کی زندگی گزار لینا انسان کا نصبُ العین نہیں ہوسکتا۔ جب سکون اور اطمینان آگیا تو پھر اس کے بعد کیا؟ یہ تو جمود کی کیفیت ہے اور فطرت میں جمود کے معنی موت ہیں۔ زندگی تو جدوجہد اور کوشش پیہم میں ہیں۔ یہ جدوجہد اور کشش پیہم ہی بقا کی ضامنِ ہوسکتی ہے۔ جب مطمئن ہی ہو گئے تو اِرتقاء ختم ہوا۔ نتیجہ میں دیکھیں تو جفاکشی ختم اور اس کی جگہ منفعت طلبی نے لے لی۔ عیش وعشرت، آرام طلبی، نفسانفسی، خودغرضی اور اِنفرادی مُنفعت طلبی نے پھر اس جگہ لا ڈالا کہ تہذیب کی تمام روشنیاں ہوتے ہوئے انسان ان ہی تاریکی کے غاروں میں رہا۔ تاریخ انسانی میں یہی کچھ ہوتا رہا ہے کہ جہاں ظاہری تہذیب و تمدن عروج پر پہنچے اندر سے پاکیزہ اِخلاق، اوصافِ حمیدہ، اور زندگی کے اعلیٰ اقدار، غیرت، حمیت، شُجاعت، سخاوت، دیانت، امانت، خدمت، مرّوت، محبت، رحمت، وغیرہ غائب ہوتی چلی گئیں اور نتیجۃً اس قوم کو زوال ہوا۔

ظاہری تہذیب، علم و دانش اور تمدن کے اس دور میں ہمیں تاریخ سے سبق لینا ہے اور اسی لیے ظاہر کے علاوہ باطن پر بھی نظر رکھنی ہے تاکہ یہ مقصد واضح ہوسکے کہ انسان محض جانوروں سے زیادہ آرام اور سکون کی زندگی گزارنے کے لئے اس دنیا میں نہیں آیا بلکہ اس کی پیدائش کا مقصد کچھ اور بھی ہے۔ مقصد واضح ہونے کے بعد ہی انسان یہ معلوم کرسکے گا کہ کہاں تک وہ اس کے حصول کے لئے زندگی گزار رہا ہے۔ آخر اس دنیا میں اس کا نصبُ العین کیا ہونا ہے؟

مقصدِ تخلیق کی تلاش ہی میں انسان حقیقت کی طرف رجوع ہوا اور زمانوں کی مطابقت سے مذاہب میں آئے۔ تمام مذاہب پر ایک عبوری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ زمانے کے مطابق مذہب کا بھی حیاتِ انسانی میں اِرتقاء ہوتا رہا۔ دین وہی ایک تھا جسے دین فطرت کہیں۔ یہ تلاشِ حقیقت انسان کی فطرت میں ودیعت تھی۔ یہ

تجسس کا جذبہ پیدائشی طور پر انسان کی بچپن کی زندگی سے لے کر بڑھاپے تک اس کے ساتھ رہا۔ اسی جذبے کے تحت اس نے اشیاء کی تلاش کی، ہر چیز کو جاننا چاہا، پھر جوانی میں اسی تلاش نے ساتھی کی تلاش کا رخ اختیار کیا مگر اس سے بھی اس فطری انسانی تڑپ کو سیری حاصل نہ ہوسکی کیونکہ اصل تو اس تلاش کی وہی حقیقت کی تلاش تھی۔ بالآخر اپنی حقیقت کی تلاش اور اپنے مقصدِ تخلیق کے معلوم کرنے کی فکر نے مذہب کی صورت اختیار کی۔ انسانی ذہن وعقل اور علم و دانش کی عام سطح کے مطابق مذاہب عالم انسان کی رہنمائی کرتے رہے۔ تمام ابتدائی مذاہب حتّٰی کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانے تک ممنوعات کی طرف زیادہ رجوع تھا کہ یہ نہ کرو، وہ نہ کرو۔ یہ ایک منفی انداز تھا۔ جس کی زمانے کے لحاظ سے ضرورت تھی۔ البتہ جیسے جیسے انسان کا باطن بھی لا کی یہ منازل طے کرتا رہا تو اس کے بعد باطنی ترقی کی طرف مُثبت قدم اٹھانے کا انداز اسلام کے زمانے میں آیا۔ اسلام میں منفی اور مثبت دونوں کی میزان تھی کہ یہ نہ کرو۔ اور وہ کرو بُرائی سے روکو اور بھلائی کی طرف بلاؤ۔ یہ نَھی عَنِ الْمُنْکَرْ وَاَمْرْ بِالْمَعْرُوْفْ کا انداز تھا اور مختصراً اس کا بیان اور اس کی طرف ہدایت کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ میں تھی جس میں ساری منفی صفاتِ انسانی کی لاتھی تو اور مُثبت صفات کی طرف پیش قدمی کی انسان کو دعوت تھی۔ یہ کلمہ خالی پڑھ لینا نہ تھا بلکہ اپنی زندگیوں کو اس کلمہ کی تفسیر اور اس کا عملی پہلو کر کے دکھانا تھا۔ اس کے بعد رحمتُ اللّعالمینی انداز مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ آنا تھا۔ منزل بہ منزل انسانیت کے لئے یہ باطنی راہ کی نشان دہی تھی۔ ارتقائے باطن کے خزانہ کی کنجی تھی۔

اِرتقائے ظاہر اور نصبُ العین

ارتقائے ظاہر کے سلسلہ میں فلسفہ جُہد لِلبقاء اور اِرتقاء کا دانشور ڈارون دائمی اقدار کے نقطہ نگاہ سے کہتا ہے کہ ”نسلِ انسانی کے لئے ذہنِ انسانی اور انسانیت کے لئے ذہنِ انسانی کا ماحول کے مطابق تبدیلی پذیر ہوتے رہنا سب سے بڑی دولت ہے کیونکہ ان چیزوں کو بقا ہے جن کی قدر و قیمت ہمیشہ اور ہر زمانہ کے لئے ہو“ فلسفہ پر مذہب کو یہی برتری حاصل ہے کہ مذہب نے انسان کو وہ نصبُ العین عطا کیا۔ جو ہمیشہ ہمیشہ رہنے والا تھا۔ فلسفے اور چند مذاہب تک کے آئیڈیل اتنے تخیلی تھے کہ ان پر عمل درآمد کرنا ممکن نہ تھا، نہ ہر انسان کے بس کی بات تھی۔ ان میں سے بہت سے نظریے قابل تعریف بھی تھے جیسا کہ عیسائیت کی عاجزی، مسکینی اور دنیا سے کنارہ کشی کا

تخیل۔ مگر اس کی منزل رہبانیت ہو کر رہ گئی۔ دوسرے مذاہب مین کچھ ایسے بھی تھے کہ ان میں ظاہری سختی اور جمود اس حد تک تھا کہ ان میں سے اِرتقاء کی راہ ڈھونڈنی مشکل تھی۔ زمانہ اور ماحول کے مطابق تبدیل پذیر ہو جانے کی نہ ان میں گنجائش تھی نہ صلاحیت۔ اور یہ دُرست بھی تھا کیونکہ ایسے نظریے اور مذاہب ایک مخصوص زمانہ میں آئے تھے۔ آنے والی نسلوں کے لئے نہ یہ پیغامات تھے، ان کا دائرہ عمل عالمِ اِنسانی کو ہونا تھا۔ منزل بہ منزل پیغامات کی وضع قطع میں تبدیلی ہوتی رہی اور مذہب اپنی اِرتقائی منازل کی طرف بڑھتا رہا۔ ان مذاہب کے لئے زمانہ کے مطابق تبدیلی پذیر ہوجانے کا سوال ہی نہ تھا اور نہ دائمی اقدار کا۔ اس لئے کہ بعد میں آنے والے زمانے میں تو دین کی تکمیل ہو جانی تھی۔ جو چیز انسانی زندگی کی شیرِ خوارگی، بچپن اور لڑکپن کے لئے دائمی ضروری تھی وہ اس کی جوانی اور بعد کی زندگی کے لئے تیاری تو ہوسکتی تھی مگر شمع ہدایت نہ بن سکتی تھی۔

اب موجودہ زمانہ تک نسلِ انسانی اپنی ظاہری باطن کی اس سطح تک یقیناً صدیوں سے پہنچ چکی ہے کہ کسی قوم کی بڑائی کا اندازہ اس کے مذہب سے لگایا جاسکتا ہے۔ مذہب وہ نہیں جو اس قوم کی کتابوں میں ہے بلکہ وہ مذہب جس کو وہ قوم اپنی روز مرہ زندگی کے عمل و کردار میں دکھا رہی ہے۔ محض ایک ذہنی یقین یا ایمان کسی نصبُ العین میں، اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ کوئی شخص یا قوم اس آئیڈیل کے مطابق زندگی گزار رہی ہے۔ کیونکہ جب تک افراد میں یہ آئیڈیل پیوست نہ ہو جائے کسی قوم کو وہ گہرائی نہیں مل سکتی جسے مذہب، یقین یا ایمان کہا جاسکے۔ بظاہر مذہب کے نام لیواؤں کا حال دیکھیں تو یہ بات صاف نظر آنے لگے گی کہ قوم کا باطنی تنزل اِسی دن سے شروع ہو جاتا ہے جس ہو جاتا ہے جب وہ ظاہر پرستی میں مبتلا ہو کر اپنے نصبُ العین سے کج روی اختیار کر لیتی ہے اور جن کا اظہار اس کی روز مرہ کی زندگی سے ہو رہا ہوتا ہے۔ ایسے افراد اور ایسے مذاہب اور اقوام کا حال یہ ہوتا ہے کہ ان کا ذہن کسی رخ کام کر رہا ہوتا ہے اور یقین اور ایمان کسی رخ۔ حالانکہ ذہن اور یقین کی میزان ہی اس کی دائمی حیات اور پائیدار اقدار کی ضامن ہوسکتی تھی۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ انسانی ارتقاء کے مطابق نصبُ العین بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے وہ کون سے اصول اور کون سی میزان ہے جس کے ذریعے ہم کسی نصبُ العین کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ قائم رہنے والی قدروں پر مبنی ہے یا نہیں؟ علامہ اقبالؒ نین نکتہ رسی کی ہے کہ اس موڑ پر انسان کو اِرتقاء کی لازمی ضرورت ماننی پڑتی ہے اور نصبُ العین کے جاوداں ہونے کے لئے یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ

کوئی نظریہ حیات جو القاء ہوتا ہے اس کی رگیں چشمہ حیاتِ اِنسانی کے سوتوں میں ہیں یا نہیں۔ دائم قائم قدر و قیمت والی اقدار اور اصولوں کی فطرتِ انسانی سے مطابقت ضروری ہے کیونکہ افراد اور قومیں آتی ہیں، زندگی گزارتی ہیں اور فنا ہو جاتی ہیں مگر حیاتِ انسانی کو تو پائیداری ہے۔ حیاتِ انسانی تو جاری و ساری ہے۔

جن نظریوں کا رُخ حیاتِ انسانی کے فروغ، اِرتقاء اور عروج کی طرف ہے انہیں دوام ہے، بقا ہے۔ اسلام فروغ انسانیت کے لئے پیام بن کر آیا ہے۔ اسلام کی تعلیم مخصوص جماعتوں، قوموں یا محدود زمانے کے لئے نہیں ہے بلکہ تمام عالم کے لئے ہے اور پیام کی تکمیل ہو چکی ہے۔ اسی ہدایت اور روشنی کو پا کر قومیں انسانیت کی عروج کی ضامن بنتی چلی جائیں گی۔ اسلام صرف موجودہ مسلمانوں کی میراث نہیں بلکہ عالمِ انسانی کے لئے پیامِ رحمت ہے۔ یہ ان لوگوں کے لئے پیامِ رحمت ہے جو اس کے اصولوں پر کاربند ہوں گے، جو اسلام کے دائرہ عمل کو اپنی روزمرہ زندگی میں عمل پیرا ہو کر مان رہے ہوں گے۔ اسلام کے اصولوں کو اچھی طرح فکر و عمل میں پرکھنے کے بعد، مغربی فلسفہ، مُفکرین و سائنس دان اور دیانت سے سوچنے والے یہی کہتے ہیں کہ اسلام ہی دائم قائم رہنے والا مذہب ہے اس لئے کہ فطرتِ انسانی کے مطابق ہے۔ اس میں لچک ہے۔ ماحول کے مطابق ساز گار ہونے کی صلاحیت ہے۔ اور تخیل کی بلندی کے باوجود قابلِ عمل بھی ہے۔ اسلام وہ ہدایت ہے کہ انسانی اِرتقاء اور ترقی کے ساتھ ساتھ اس میں تا ابد دائم قائم رہنے کی صلاحیّت ہے۔ اسلام ہی وہ نظریہ ہے کہ انسان کے اندر حیوان کو بھی نظر انداز نہیں کرتا اور ان ملکوتی صفات کو بھی جو انسان میں ہیں کچھ اس طرح عمل پیرا کرانا چاہتا ہے کہ تخیل عرش پر ہو مگر پاؤں زمین پر ہوں۔ زندگی حقیقت بینی پر مبنی ہو۔ اسلام کے نزدیک انسان کی اِنفرادی ترقی، جسمانی، اخلاق، روحانی، سب کی سب دوسرے نمبر پر ہیں۔ تمام عالمِ انسانی کے اِرتقاء اور ترقی کے مقابلے میں اسلام کے اصول ایسے ہمہ گیر ہیں کہ نہ مذہب و نسل کی تفریق ہے نہ کالے گورے کی۔ آج ہی کیا، آنے والے زمانے میں اور ابد الاباد تک وہی گروہِ انسانی ترقی پذیر ہوں گے جو سب سے زیادہ عین اسلام کے مطابق زندگی گزار رہے ہوں گے خواہ ظاہر طور پر وہ اپنے آپ کو کسی اور مذہب یا کسی اور نظریے سے منسوب کر رہے ہوں اور اپنی ترقی کو خواہ کسی مذہب یا تہذیب سے وابستہ کر رہے ہوں یا کسی فرد کی تعلیمات کو اپنے فروغ کا سبب بتا رہے ہوں۔

آج ایسے سارے دانشوروں اور قائدین کی تعلیمات کا تجزیہ کیا جائے تو صاف نظر آجائے گا کہ یہی تو وہ اصول تھے جو تیرہ سو سال پہلے اسلام نے پیش کئے تھے۔ اور یہ سب کچھ تو اسلام کی کُلّی تعلیمات کا صرف ایک حقیر ساحِصّہ ہیں جن کا تعلق انسان کی روزمرہ زندگی سے ہے۔ اسلام کی ظاہری تعلیمات کو ہی ان کے اصلی رنگ یعنی سپرٹ میں اپنا کر آج غیر قومیں فائدہ اٹھا رہی ہیں اور اسلام کے نام لیوا صرف ظاہر داری اور ارکانِ دین کو اسلام سمجھ بیٹھے ہیں حالانکہ ارکانِ دین کے پیچھے اصل تعلیم جمعیت بندی اور اجتماعی فلاحی زندگی گزارنے کے لئے تھی۔ پھر اسلام کے باطنی اسباب پر کس کس کی نظر ہے۔ یہی تو مولا اور بندے کا رشتہ اُستوار ہونا تھا۔ مقصدِ تخلیق کو پورا کرنے کے لئے پہلا قدم اٹھانا تھا اور کچھ اس انداز سے کہ ''اُدھر اللہ سے واصل، ادھر مخلوق میں شامل'' دین اسلام تو کھرا کھوٹا پرکھنے کے لئے ایک کسوٹی ہے۔ جیسے جیسے عقلِ انسانی پچھلے بُغض، عناد اور زہر افشانیوں سے خالی ہو کر اپنے حُسن و خوبی کو دیکھے گی اس کی پہلے سے ہی نشان دہی اسلام میں پائے گی۔ پھر کہیں اس آئینِ فطرت کو اپنے حُسن و قبح کا جائزہ لینے کے لئے آئینہ بنائے گی۔ اور کیسا انسانی حُسن اور قبح۔ وہ وقت بھی آجائے گا کہ ذاتِ باری تعالیٰ کے جلال و جمال کی تجلیاں اپنے ہی پیکر میں کائناتِ عالم دیکھ سکے کہ خود شیرِ خُدا بن کر اس کے جلال کو دکھا سکے اور خود مشکل کُشائی کر کے اس کے جمال کا پیکر بن سکے۔

نسلِ انسانی کی بقاء

فطرتِ انسانی یہ ہے کہ فرد کو فنا ہے اور نسل کو بقاء ہے۔ نسلِ انسانی کی بقاء کی ضامن جمعیت بندی ہے۔ نسلِ انسانی کی حیات کی آسانی، ضمانت اور فروغ کے لئے جمعت بندی ہے ایک دوسرے سے مِل جُل کر رہنا سہنا، ایک دوسرے کے کام آنا، لین دین میں حقوقُ العباد کی نگہداشت کرنا، اور معاشرتی اصولوں کے تحت زندگی گزارنا جمعیت کے بقاء کے سامان ہیں۔ ہمدردی، حُسنِ ُ ِ اخلاق، بے لوث خدمت، مُروّت، محبت، رحمت وغیرہ مُثبت اندازِ زندگی ہیں۔ ان پائیدار اقدار کو دوام ہے۔ گویا دوسرے معنی میں فرد کی زندگی جمعیت کی زندگی کے لئے ہے۔ ارتقاء انسانیت اور فروغِ جمعیت ایک مسلمان کا نظریہ ہے۔ اس نظریے میں پائیداری ہے، فروغِ انسانیت ہی فروغِ اسلام ہے اسی لیے اسلام میں وسیع النظری ہے۔ یہ قوم، نسل، رنگ، تہذیب، اور معاشرتی اصولوں کو یک

رُخی عطا کرتا ہے، خدا تک رسائی کا ذریعہ بھی مخلوق تک رسائی کو قرار دیتا ہے، عین دین گرادنتا ہے۔ ظاہر و باطن کی یہ یک رخی کو دوسرا کون سا مذہب نظریہ یا آئیڈیل بخشتا ہے؟ قومی عروج کو کسی نہ کسی خطّہ تک محدود رکھتا ہے نہ کسی نسل تک بلکہ آغوشِ رحمت میں ساری انسانیت کو لے کر ایک ہی قوم گردانتا ہے۔ قومی نظریہ کی یہ بلندی اور قوم کے تخیل کا یہ عروج نہ کسی مذہب نے پیش کیا اور نہ کسی انسان نے جس کے ماننے والی قوم کے تصور میں یہ ہمہ گیری ہے وہ مذہب، مذہبِ عالم کیوں کر نہ ہوگا۔ اس کا نصبُ العین دائم قائم کیونکر نہ ہوگا؟ انسانی عروج اور اِرتقا کی ظاہری باطنی منازل اسی کی دسترس میں ہوں گی۔ یہی مذہب حق کے اس جذبہ محبت کی آئینہ داری کر رہا ہوگا جو اسے اپنی مخلوق سے ہے۔ یہی مذہب مقصد تخلیق کی تکمیل کی طرف انسانیت کو لے جا رہا ہوگا۔ یہاں تک کہ ذرہ ذرہ حق کی طرف رجوع ہو جائے گا، اِلَّا یَعْبُدُوْنَ کا پیکر بن جائے۔ باغ ہستی میں اس اَحْسَنِ التَّقْوِیْم کی ہستی وحیات کی مُسرتوں، شادکامیوں، ولولہ انگیزیوں، عشق کی سرمستیوں میں میثاق ازل کا وہ نمونہ پیش کر سکے کہ اَحْسَنِ الْخَالِقِیْنِ بھی کہہ اٹھے کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ط

بادی ء النظر میں قوموں کی زندگی میں بات اصولوں کی ہے تمام مذاہب والے اپنے اپنے اصولوں پر نازاں ہیں مگر کوئی بھی عمدہ اصول فطرت انسانی سے جُدا نہیں اور اسلام سے باہر نہیں۔ فرمان باری ہے کہ اس دنیا میں جو بھی نیکی کرے گا اس کے لئے اجر ہے، خواہ ایمان لائے یہ نہ لائے، مگر کلمہ گو کے لئے دونوں جہان کی خیرو برکت ہے مردمومن کلمہ کو اپنا کر، مشیّت کا ہاتھ بن کر، مقصد آفرینش کو پورا کرتا ہے۔ مقصد آفرینش میں عشق ہی دائم و قائم ہے۔ کشش، محبت، ایمان، عشق ہی اجزائے بندگی ہیں۔ جو چیز ساری کائنات میں خُوبی اور حُسن پیدا کئے ہوئے ہے وہ پرکشش چیز عشق ہی ہے۔ جمادات میں پرکشش ہے تو جانداروں میں محبت عشق و ایمان کی رعنائی کو نور کہتے ہیں۔ یہی نُورِ مُحمدیؐ ہے۔ یہی فطرت کے ساتھ ہم آہنگی ہے اور یہ دائم و قائم ہے۔ اب ہم اپنا جائزہ لیں کہ کونسی چیز ہم میں دائم قائم رہے گی۔ جسم، دولت، عزت؟ اس سوال کا جواب، بغیر اپنے آپ کو دھوکا دیے اگر خلوص سے اپنے دل میں تلاش کرو تو عشق پاؤ گے۔ اسی کو خواہ ایمان کہہ لو، بھروسہ کہہ لو یا اعتمادِ شخصیت کہہ لو۔ آج اپنے دلوں کی گہرائیوں میں ہم دیکھیں تو حرمتِ اسلام اور ناموسِ رسُولؐ تو ہم میں موجود ہے۔ اسلام کے پیام کے

جاوداں ہونے پر بھی ہمیں اعتقاد ہے۔ مذہب کے ناموس کی خاطر ہم جان دینا بھی جانتے ہیں، عشقِ نبیؐ کی آگ بھی سینوں میں دبی رکھتے ہیں جو وقتاً فوقتاً بھڑک بھی اٹھتی ہے مگر اس کی کیا وجہ ہے کہ اس کو قیام نہیں ہوتا اور عملِ پیہم کے لئے قدم نہیں اٹھتے ؟ مسلسل عملِ پیہم سے آخر یہ قوم کیوں نا آشنا رہی ہے اور زمانہ میں اس کی حالت کیوں اب تک ابتر ہے؟ دنیا کے دوسرے لوگ بھی اس پیام کی خوبی کو صرف اسی وقت دیکھ سکیں گے جب اس کی عملی تفسیر مسلمانوں کی زندگیوں میں دیکھ لیں گے۔ اسلام کی خوبیاں اس کے پیرویان کے حُسنِ ظاہر و باطن ہی سے نمایاں ہوسکتی ہیں نہ کہ صرف ارکان دین کی پیروی کو دکھا کر۔

اسلام، مکمل ضابطہء حیات:

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس کی بنیاد پانچ ارکان پر ہے۔ توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج۔ جہاں باقی ارکان کی عملی صُورتیں ہیں وہاں توحید کی بھی عملی صورت اپنی زندگیوں میں آنے دو۔ کلمہ، وحدانیت پر یقین و نبیؐ کی رسالت کی تصدیق کو اپنی زندگی کا شِعار بنا لو، جُزو ایمان بنا لو، محرک قوتِ عمل بنا لو۔ یہ محض ذہنی اقرار کی بات نہیں ہے، یہ بھروسے اور عشق و ایمان کی بات ہے۔ اس قوت کو اپنے اندر محسوس کرو۔ محسوس کرو اور شدت سے محسوس کرو۔ نبیؐ کی رسالت کی تصدیق، نبی کے کلمہ کی اور وحدانیت پر یقین کو ایک ہی چیز بتایا گیا ہے۔ یہ عشقِ نبیؐ ہی کی بات ہے اور اسی میزان میں اپنی توحید کا اندازہ لگاؤ۔ بغیر نسبتِ محمدیؐ اور بغیر عشقِ رسُولؐ کے یہ نصیب نہیں ہوسکتی۔ یہ عشق، یہ ایمان، یہ بھروسہ، یہ قوتِ عمل بغیر اس تعلق کے قائم نہیں ہوسکتا۔ اسی عشق و محبت و ایمان و بھروسے کی روشنی ہی میں تمھاری باطنی صلاحیتیں اُجاگر ہوسکتی ہیں اور کاروبارِ جہاں میں بھی تمھیں علم پیرا ہونے کے لئے تقویت دے سکتی ہیں۔ یہ فطری، باطنی صلاحیتیں ہی تمھارے اندر سے حقیقت کی رُونمائی کرتی ہیں۔ فِی اَنْفُسِکُم یہی بات ہے۔ یہ فطری صلاحیتیں قدرتی طور پر ہر ایک بچے میں اپنی تمام حُسن و خوبی کے ساتھ موجود ہوتی ہیں۔ تب ہی اس کا ظاہر و باطن ایک توحید میں ہوتا ہے، یعنی جو اندر ہے وہی باہر، نہ کوئی منافقت نہ کوئی شِرک اور نہ کوئی فساد۔ توحید کی اسی فطری سادگی کی رُونمائی اپنے ظاہر و باطن کے توحید عمل میں ہونے دو۔ اپنی ساری صلاحیتوں کو اور ظاہر و باطن کی سب قوتوں کو ایک ہی رخ پر سرگرم عمل ہونے دو۔ عاشق میں فطری طور پر بچے کی

طرح توحید ہوتی ہے۔ اس کی ساری صلاحیتیں محبوبؐ کی خاطر ایک ہی رخ ہو جاتی ہیں۔ ایک مُجاہد میں اس یک رخی، اس فریفتگی اور اس والہانہ عشق کا نظارہ کرو۔ کس طرح وہ محبوبؐ کے نام کی حُرمت کے لئے میدان میں نکل آتا ہے۔ اس وقت نہ اسے دنیا کی طلب ہوتی ہے نہ آخرت کی۔ بس محبوبؐ پر فدا ہو جانا ہی اس کا ایمان ہوتا ہے۔ یہی جذبہ اسے ہر آہنی دیوار کو توڑ دینے کی ہمت و وُسعت عطا کرتا ہے۔ ساری کی ساری جمعیت، ساری کی ساری عالمِ انسانیت کو وہ محبوبؐ کے لئے اسی اندازِ توحیدِ فکر میں رخ بخشتا ہے۔ پہلے اس میں اپنے اندر باہر کی توحیدِ فکر ونظر ہوتی ہے۔ وہ یہی توحیدِ فکر ونظر وعمل اپنے اردگرد کے ماحول کو بخشتا ہے۔ پھر جمعیت اور عالم انسانیت کو۔ مگر جب یہ توحیدِ فکر ونظر وعمل پھیلنا شروع ہوتی ہے تو کائناتِ عالم اس کی دسترس میں ہوتے ہیں۔ اس توحید سے جمادات، نباتات، حیوانات، ملائک و انسان میں سے کوئی بھی خالی نہیں ہے۔ بات صرف اپنی اپنی سطح کی ہے۔ انسان کو شرفِ فضیلت بخشا گیا اور خلیفۃُ اللہ کے خطاب سے نوازا گیا۔ تب ہی تو خواہ بچّہ ہو یا مُجاہد، خواہ زاہد یا صُوفی، جس جس نے بھی اپنی توحید کو پالیا وہ پھیلتا ہی گیا، پھیلتا ہی گیا اس توحید کی وُسعتیں تو بے حد و بے پایاں ہیں۔ ''وَسِعَ کُرسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْض''

اسلام کی ان وُسعتوں پر نظر رکھی جائے تو یہ معلوم ہو گا کہ اسلام ایک مُکمّل ضابطہ حیات ہے۔ اور اصل حیات وہی ہے جسے دوام ہو، قیام ہو۔ اِس ضابطہ حیات کا دنیوی زندگی سے تعلق بھی ہے ساٹھ ستر سال تک ہے مگر یہ آخرت کی پونجی بھی بتائی گئی ہے۔ اس صورت میں ارکانِ دین کی بے دِلی سے ادائیگی یا رسمی خانہ پُری کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ بلکہ ایک شدتِ عمل، ایک والہانہ جذبے کے تحت یہ سب کچھ کرنا ہے۔ اور اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ ہر عمل میں صرف جمعیت کا تخیل ہی نہیں بلکہ جمعیت کی فلاح کا عملی پہلو ہی صرف پیشِ نظر رکھنا ہے کیونکہ ضابطہ حیات تو ضابطہ جمعیت کی بات ہے اور اس کا تعلق انسانی زندگی کے معاشرتی، معاشی، اخلاقی، اقتصادی، مذہبی اور دفاعی، سب ہی پہلوؤں سے ہے۔ لہٰذا تمام ارکانِ دین توحید، روزہ، نماز، زکوٰۃ، حج، سب کے سب جمعیت بندی کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کے لئے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہو رہا تو ہمارے ایمان میں فرق ہے، ہماری توحید میں کھوٹ ہے۔ لہٰذا یہ اصولی خرابی ہمارے اپنے تخیل میں ہے جو ہم نے ارکانِ دین کی بابت اپنی طرف سے تجویز کر رکھے ہیں۔ اور یقیناً یہ بات ہے کہ ہم نے ان سب میں صرف انفرادی پہلو پر زور دے کر اپنی

اپنی عاقبت بخیر کرنے کی فکر کی ہے۔ ان ارکان کے ذریعے جس چیز کو مضبوط کرنا تھا وہ جمعیت بندی تھی، ایمان تھا۔ اس کو تو بھلا دیا اور صرف ارکان کی پابندی کو جزو دین بنا لیا ہے، دین تو جمعیت بندی کی بات تھی۔ اور یہ ارکان تو صرف بنیاد تھے جن پر دین کی عمارت کھڑی ہونی تھی۔ جمعیت کو دنیوی اور آخرت کی زندگی کے ہر پہلو پر اسی جماعت بندی کے ذریعے فروغ دینا تھا۔ ایک دین میں ہونے کے معنی یہ تھے کہ زندگی میں جمعیت کے اندازِ فکر کو اپنانا تھا۔ جمعیت ہی کو حیات ہے اور جمعیت کو دوام۔ فرد کو تو بالآخر فنا ہونا ہی ہے۔ البتہ اپنے صِدق، خُلوص اور خدمت کا صلہ آخرت میں دامنِ شفاعت میں پانا ہے۔ محبوبؐ کے سامنے سُرخرو ہو کر پہنچنا ہی ہر مومن کا مطمحِ نظر ہے، تاکہ دُنیا کی زندگی بھی سب کی سب ساتھ ہو اور آخرت بھی سب کی سب ساتھ۔ یہ آدھا آدھا دین کیا جس میں کالے، گورے اور اپنے، غیر کی تمیز باقی رہے۔ لاکھ عبادت کر لو، لاکھ ارکانِ دین ادا کر لو، اگر یہ دُوئی باقی ہے تو توحید کہاں؟ دین و ایمان کہاں؟ کیسا مومن! مسلمانی بھی کہاں؟ اس سے آج مسلمان اپنے آپ کو دیکھ لیں تو سوائے ظاہر و باطن کی منافقت کے اپنے اندر کیا پائیں گے۔ کیسا مقامِ روح و ملائک کی باتیں، کیسی قلب و عشق کی وارداتیں، ابھی تو ہر طرف جمعیت مقامِ نفس میں ہی گرفتار ہے۔ مادّی اور جسمانی، ذہنی اور ہوا و ہوس کی سطح سے ہی نہیں اُٹھی۔ اسی سطح سے اس کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ اسلام کے فلاحی، اخلاقی پہلو کو عوام کی روز مرہ زندگیوں سے منسلِک کرانا ہے۔ عوام سے رابطہ کے لئے اوچھے ہتھیار استعمال نہیں کرنے کہ انہیں استحصال اور نا انصافیوں کا احساس دلا کر درندہ صفت بنا دیا جائے۔ انہیں مجرم و قاتل بنا دیا جائے۔ یا تعلیماتِ اسلام کی وضاحت اور وعظ و پند و نصائح سے صرف وقتی طور پر انہیں قائل کر لیا جائے۔ اور عملی زندگی کی طرف کوئی لائحہ عمل نہ پیش کیا جائے، نہ کوئی نصب العین مقرّر کیا جائے۔

سالارِ زماں کی اِحتیاج

وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔ زمانہ کہاں سے کہاں جا رہا ہے۔ اب اس کا بھی تو وقت نہیں ہے کہ صرف منفی پہلوؤں پر زور ڈال کر قوم کو برائیوں سے دُور کرنے، سمجھنے اور غور و فکر میں لگا دیا جائے۔ یہ کام تو مصلحین نے برسوں سے کیا ہے اور بہت کم اصلاح ہو سکی ہے۔ خرابیوں کو گنا جائے تو سینکڑوں یا ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں ہیں۔ کس کس کا تدارک ہو سکے گا۔ اور اس کے لئے تو ایک انسانی زندگی جو زیادہ سے زیادہ ساٹھ ستر سال ہو سکتی

ہے نا کافی ہے۔ اس طرح تو قوموں کی زندگیاں سدھارنے کے لئے صدیاں چاہئیں۔ اس وقت جب کہ مریض جاں بلب ہے وقت کا تقاضا یہ ہے کہ صحت کے اصول بتائے جانے کی بجائے کوئی علاج تجویز کیا جائے۔ اس وقت مُثبت اقدامات کی ضرورت ہے۔ منفی پہلو خود بخود غائب ہونے لگیں گے۔ حُرمتِ اسلام اور ناموسِ رسُولؐ کا جذبہ قوم کے دل کی گہرائیوں میں ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اسلام کی خاطر مرمٹنا ہزار عبادتوں سے بہتر ہے جو صرف اپنی عاقبت کی خاطر ہوں۔ رہنما کی تلاش میں اس کی آنکھیں ہمیشہ سے راہ تکتی ہیں اور اصولِ فطرت بھی یہی ہے کہ لاکھ اصول موجود ہوں، اسلام کے قوانین موجود ہوں، پیام کی خوبیاں موجود ہوں اور اس پیام میں اپنی فطری سادگی کے باعث دعوتِ فلاح وعمل بھی ہو، تب بھی جانِ اسلام کی طرف رجوع کرانے کے لئے ایک رہبر کی ضرورت ہوتی ہے تب ہی تو تاریخِ انسانی میں ہادیانِ دین آئے اور قوموں کی زندگیوں میں ایسے افراد آتے رہے جو انہیں ایک نصبُ العین عطا کرکے معروف عمل کراتے رہے۔ آج بھی اسلام کے اخلاقی پہلوؤں اور روز مرہ زندگی سے متعلق اصولوں پر کاربند کرانے کے لئے ایسے لیڈر کی ضرورت ہے جو فیصلہ کر سکے کہ اوّل کن کن اقدامات کی ضرورت ہے۔ یہ تو فیصلہ کُن بات ہے کہ عوام کا کام محض پیام رسانی سے نہیں بنتا بلکہ ساتھ چل کر راہ بتانی پڑتی ہے۔ مخلص ہو کر خلوص کا جذبہ، مجاہد ہو کر جہاد کا جذبہ، یہاں تک کہ زندگی کے ہر پہلو میں مسلسل جہاد کا جذبہ عام کرنا ہوتا ہے۔ سختی، نرمی سب کچھ اسی مقصد کے حصول کی خاطر خلوص کے تحت کرنی ہوتی ہے۔

آج عام حیاتِ انسانی میں ایک جنگل کا سا قانون چل رہا ہے۔ قوم کی زندگی یوں گزر رہی ہے جیسے مویشی، جانور، کیڑے مکوڑے، چوپائے، درندے زندگیاں گزارتے ہیں۔ پہلے انسان کسی زمانے میں شیر صفت تھے مگر آہستہ آہستہ خودغرض اور درِندہ صفت بن گئے۔ کہیں مُردار خوری ہے، کہیں حسد، بغض، مکاری، عیاری، وحشت و درِندگی کا یہ عالم ہے کہ کہیں پس ماندہ کھانے والے گیدڑ اور لومڑیاں ہیں، کہیں گندے اور ناپاک سور ہیں کہیں وفا نا آشنا جنگلی کُتے ہیں، کہیں شرم و حیا سے مبرا ریچھ اور بندر ہیں، کہیں خچر اور بھیڑ بکریاں ہیں۔ محض زندگی گزارنے والے چوپائے کہ جدھر کسی نے چاہا ہنک گئے جب کسی نے چاہا بک گئے۔ الغرض سب کے سب جنگلی ہیں۔ عاقبت نا آشنا۔ نہ اتحاد، نہ تنظیم۔ ایسے میں ایک (Grey Wolf) گرے وُولف کی ضرورت ہے، ماحول کی موجودہ حالت خود اس کی نشاندہی کر رہی ہے۔ ماحول ہی لیڈر بناتا ہے اور لیڈر ماحول ہی کی عکاسی کرتا ہے۔ آج

مسلمانانِ عالم کی بقاء کے لئے کیڑے مکوڑوں کو صاف کرنا ہے۔ کھوکھلے ڈھانچوں کو ختم کرنا ہے اور مغز و معانی کی طرف نظر رکھنی ہے۔ جانِ اسلام کی طرف رجُوع ہونا ہے۔ ''گرے وولف'' کا یہی انداز ہوتا ہے کہ اس میں شیر جیسی دھاریاں بھی ہوتی ہیں اور اس کی خاص صفت یہ ہے کہ ہڈیوں تک کو چبا جاتا ہے، گودا کھاتھا ہے۔ مغز ہی، یعنی اصل حقیقت سے تقویت پکڑتا ہے۔ اس کے ساتھ وولف پیک (Wolf Pack) بھی ہوتا ہے۔ آج ہم سب کو وولف پیک ہی بن جانا ہے۔ یہ عجز و انکساری کا زمانہ نہیں۔ اب بزن کا زمانہ ہے۔ پہلے بزن اپنوں پر تھا اب دشمنانِ قوم اور دُشمنانِ اسلام پر ہے۔ ہماری قسمت میں جو گرہ لگی ہے وہ فتح سے کھلے گی۔ انشاء اللہ یہ ہو کر رہے گا۔ اسلام کی تاریخ میں ہے، مسلمانوں کے خون میں ہے کہ بغیر فتح و نُصرت کے اکٹھے نہیں ہوتے۔ ہماری قوم پر یہ بات صادق آتی ہے کہ کامیابی سے زیادہ کامیاب کوئی چیز نہیں۔ ہمارے دن پھرنے کا یہی آسان اور یقینی طریقہ ہے۔ فتح کے معنی کھولنا ہے۔ قسمت کا کھولنا ہے خوابیدہ فطری صلاحیتوں کو پیدا کرنا ہے۔ خود اعتمادی پیدا کرنے کے ہر مشکل کا مقابلہ کر کے کامیابی حاصل کرنی ہے۔ ترکی کی مثال سے سبق لیں کہ وہاں عین اُس وقت جب سب سے بڑی اسلامی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی۔ اور ملک دُشمن کے نرغے میں تھا۔ ایک ''گرے وولف'' آیا جس نے بغیر کسی بیرونی سہارے کے اپنی فطری حمیّت اور غیرت کے جوش میں اپنے اردگرد کے غولِ بیابانی کو ہٹا کر دشمن پر حملہ کیا۔ اور اپنی پوری قوم کو ایک ''وولف پیک'' Wolf Pack بنا دیا۔ پولینڈ کی مثال لیں۔ وہاں چھ مختلف جماعتیں آپس میں لڑتی رہی۔ لاکھوں مر گئے۔ ایک شخص ایسا آیا۔ جس نے قوم کے اصولوں کو قربان کیے بغیر فاکسینکی دو تین پالیسیوں، لیبر، اقتصادی وغیرہ کو قبول کیا اور شکست خوردہ قوم کو کامیاب بنا دیا۔ کچھ اسی طرح اسلام کے سماجی، معاشی، اخلاقی، اقتصادی، معاشرتی، قانونی، دفاعی نظام کو عملی صورت میں اپنانے کے لیے قوم کو رخ دینے والے کی ضرورت ہے۔ قوم کو بس ایک مرکزیت چاہیے۔ جسے وہ اپنا آئیڈیل بنا کر آگے بڑھے۔ اُسے خلافت کہہ لو یا اسلامک کنفیڈریشن سالار کی ذات میں قوم کو بھروسہ بھی ملے گا۔ اور خود اعتمادی بھی۔ قوم اِس مرکزیت کے عملی پہلو کے فائدے اپنی زندگی میں دیکھ دیکھ کر نئی حیات میں داخل ہو جائے گی۔ اور اِس کنفیڈریشن کی طرف پھیلتی جائے گی پھر اجتماعی عمل کے فائدے سامنے آتے جائیں گے تو معلوم ہونے لگے گا کہ اسلام نے کیوں جمعیت بندی کا سبق اس شدت سے دیا تھا؟ کیوں حضور نبی کریمؐ نے معراج میں اُمّتی اُمّتی کی فریاد کی تھی۔

مسلمانوں کی قومی زندگی کا شعار، آداب، اخلاق، معاشرتی اور سماجی اصول تھے۔ عزتِ اسلام اور ناموسِ رسول کی خاطر جمعیت کی فلاح میں مصروفِ عمل رہنا ان کا دین، ایمان، اور عبادت تھی۔ ارکانِ دین کی پابندی اسی رشتہ کو مضبوط رکھنے کا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ اخوت اور جمعیت بندی ان کے لئے ایسے مستحکم نصب العین بن گئے تھے کہ زمانے کی اونچ نیچ بھی اس میں فرق نہ ڈال سکتی تھی۔ گویا فلاحی جمعیت کا نظریہ قومی زندگی کے خون میں شامل ہو چکا تھا۔ اب بھی نئی حیات کے لئے یہی کچھ ہونا ہے۔ فوری اور دور رس پالیسیوں پر قوم کو کچھ اس طرح یقین آتا چلا جائے گا کہ وہ اپنی منزل کے حصول کے لئے ایک مقرر کردہ راہ پر اپنے آپ کو گامزن پائے گی اور تیس چالیس سال کا انتظار بھی اسے بے صبر نہ بنائے گا۔ اس کی قسمت میں تو عالم میں پھیل جانا ہے، بس قدم اٹھانے کی دیر ہے۔ رفتہ رفتہ دشمنانِ دین کی بساط الٹ جائے گی۔

پانچ سو سال کی تاریخ دیکھی جائے تو ہنود و یہود و نصاریٰ نے طرح طرح سے اسلام کے اس نصب العین کی بیخ کنی کی ہے۔ کبھی مشقت و محنت و عملی زندگی سے ہٹا کر خشک اور بے جان طریقے سے ارکانِ دین کی ادائیگی کی طرف رجوع کر دیا۔ کبھی اہل دانش اور لیڈروں کے ذہنی تخیل میں اپنی تعلیمات سے ہیجان بپا کر کے نئی نئی راہیں تلاش کرنے میں ڈال دیا ہے۔ کبھی زر پرستی، اقتصادیات اور معاشیات میں عوام کو الجھا دیا ہے۔ کبھی لسانی، نسلی، علاقائی منافرت کو ہوا دی ہے۔ کبھی تعلیماتِ دین و وعظ پر پند و نصائح کو عمل صالح قرار دلایا ہے، حالانکہ ہر عمل صالح کی بنیاد خدمت خلق ہے، خود مصروفِ عمل ہو کر خلیفۃ اللہ بننا۔ الغرض طرح طرح سے قوم کا شیرازہ منتشر کرایا گیا ہے۔ مرکزیت اور لیڈ شپ کا تخیل قومی زندگی سے ختم کرا دیا ہے۔ دین کی بنیاد یہی مرکزیت تو تھی۔ جب مرکز ہی نہیں تو یہ عمل اور فروغ کی ہوائیں کہاں سے اٹھیں۔ انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ محض ضروریات زندگی کو اپنا مقصدِ زندگی نہیں بناتا۔ وہ ایسے نصب العین کی تلاش میں ہوتا ہے جس کو دوام ہو، بقا ہو۔ اس نصب العین اور مقصدِ زندگی پر وہ اپنا سب کچھ فدا کر دیتا ہے۔ اپنی جان تک قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔ یوں جھوٹے اور عارضی نصب العین تک کے حصول کے لئے انسان اپنی جان دینے سے دریغ نہیں کرتا تو وہ مقصد زندگی جو اسے سب سے زیادہ عزیز ہوتا ہے سوائے اس کے کیا ہوتا ہے کہ اپنے محبوب کی خاطر جئے، اس کے لئے اپنے عمل و کردار وقف کرے اور اسی کے لئے جان تک قربان کر دے۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے اپنا محبوب کس

شے،نظریہ، یا فرد کو بنا رکھا ہے۔ مسلمان کوتو خوش بختی سے پائندہ و جاوید محبوبؐ نصیب ہے۔ بس اسی کی طرف قوم کو رجوع کرانا ہے۔ یہی سالارِ زماں کا کام ہے۔ مسلمان کی اس ضد کو دیکھ کر دشمنانِ دین کی یہ کوشش رہی ہے کہ بجائے ایک مرکز کے ایسے چھوٹے چھوٹے کئی مراکز قائم کر دئے جائیں تا کہ ان سے اگر فروغ کی لہریں اٹھیں تو ایسی بے ترتیبی سے پھیلیں کہ رخ ہی اختیار نہ کرسکیں، اور آپس میں ٹکرا ٹکرا کر ختم ہو جائیں۔ اسی طرح قوم کو عارضی یا غلط نصب العین دے کر قوم کے مختلف حصوں کی راہ بھی کھوٹی ہوئی ہے۔ اور ایک دوسرے سے کھینچ گئے ہیں۔

قوم کو متحد رکھنے اور ایک جاوداں نصب العین دینے کی کوشش بہت سی ہستیوں نے کی ہے۔ وہ پیام جو حضرت شاہ ولی اللہؒ ، اسمٰعیل شہیدؒ، سرسیدؒ، اقبالؒ، قائداعظمؒ،عبداللہ سندھیؒ، جمال ادین افغانیؒ، اور دیگر مصلحین و مجاہدین کا تھا اسی قوم کی گھٹی میں ڈالا جا چکا ہے۔تو ایک نہ ایک دن وہ آدمی بھی میدان میں نکل کھڑا ہوگا، جو پھر سے اس قوم کے محل کو کھڑا کر دے گا۔ جب پوری قوم میں مسلمانوں کی موجودہ حالت کا دکھ درد موجود ہے، جب تک عالم اسلام ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہے تو بس بات اتنی ہی ہے کہ قوم کی مرکزیت کسی نہ کسی طرح قائم ہو۔ وہ سالارِ زماں عالم اسلام میں ہے کیوں نہ نکل آئے۔ مہدی علیہ السلام کے انتظار کی ضرورت نہیں۔ آخر ہمیں بھی تو اپنی زندگی میں کچھ نہ کچھ کر گزرنا ہے جس سے جمعیت کی زندگی کو استحکام اور دوام ملے۔ اگر ہم سب میں جذبہ کی شدت ہو، اُمت کے لئے آنسو بہانے کا جذبہ صرف چند ہی میں ہو،تو وقت کا انتظار بھی ختم ہو جائے گا۔ کہیں نہ کہیں سے رحمتٔ لِلعالمینؐ کے صدقے وہ مردمجاہد نکل آئے گا جسے راہِ عمل القا ہو کر ہدایت من جانب اللہ حاصل ہوگی۔ پھر وقت کے لحاظ سے قدرت خود ہی اپنے منتخب شخص کی رہنمائی کرتی ہے۔اس اُمت کی گزشتہ تاریخ میں اگر کعبے کے محافظ صنم خانے والوں سے ساز باز میں لگے رہے ہیں تو مسلمانوں کا بے سروسامانی کا واحد سہارا اور تاب وتوانائی کا اکلوتا مرکز صرف انوارِ نبوت کی ضیا پاشیاں ہی رہی ہیں۔ اس طرح اسلام کے فروغ کا عملی پہلو ہمیشہ رحمتٔ اللعالمینؐ کے صدقے نصیب ہوا ہے۔ اسی کے سہارے اس اُمت کو زمانے کے لئے رحمت بن جانا ہے۔ فساد، منافقت، اور ہر’لا‘ کو مٹانا بھی رحمت ہے۔ خس و خاشاک جلا دینا بھی، شجر تراشی کرنا بھی رحمت ہے۔ کیڑوں مکوڑوں سے زمین پاک کر دینا بھی رحمت ہے۔ ڈاکٹر کی طرح ناکارہ

،گندے، سڑے اعضائے جسمانی کاٹ دینا بھی رحمت ہے۔ بات بس ہدایت من جانب اللہ کی ہے۔ اسی لئے اسلام کی روح کو سمجھو۔ اسلام کے معنی امن اور سلامتی کے ہیں، پھر بھی فتنہ وفساد، منافقت کی بیخ کنی پر زور دیتا ہے کہ اصل دین تو اتحاد ہے، جمعیت ہے۔فروغ اسلام کے معنی ارکانِ دین کا پھیلانا نہیں ہے، بلکہ اخلاق دین کا پھیلانا ہے، محبت ، اخوت کا پھیلانا ہے۔ جو اس راہ پر نہ چل رہا ہو، وہ لاکھ عبادت کرے، خلق اور خدا دونوں کے لئے بے کار ہے۔

ماحول اور زمانہ کی مطابقت سے بیمار قوم کو نفس کی ابتلاؤں سے بچانا ہے۔ اس میں پہلی ابتلاء انانیت کی ہے، میں اور نفسانفسی کی ہے، اور کچھ اتنی شدت سے کہ جیسے جمعیت کے تخیل کو بھول ہی گئی ہو۔ مرکزیت یا نقطے کی طرف رجوع ہونا ہی نہ جانتی ہو۔ اس سطح سے جانداروں کے لئے ڈنڈا چاہیے یا لالچ، کھانا ، پینا، مالِ غنیمت کہ بنیادی فطرت انسانی کی یہی حیوانی ضروریات ہیں۔ جب ان سے شکم سیری ہو جائے تب اعلیٰ اقدار کی طرف لا سکتے ہیں۔ یعنی لطیفہ نفس کی سطح پر جہاں کہ نفس کو تہذیب اور شائستگی عطا ہوتی ہے، اخلاق میں پاکیزگی آنے لگتی ہے، ذاتی مفاد سے نظر ہٹ کر جمعیت کی خاطر زندگی بسر ہونے لگتی ہے۔ تب ہی کہیں وہ والہانہ جذبہ وشوق شہادت، حرمتِ اسلام اور ناموش رسولؐ قوم کے رگ و پے میں پیوست ہوتا ہے۔

؎ تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است
لیکن کشید آں زکمانِ محمدؐ است

قربان چشمِ یار پہ دیر و حرم کریں
سجدے جبینِ شوق کے وقفِ صنم کریں

سینچیں لہو سے ذکر کے ایمان کی کھیتیاں
مُو ئو میں غرق، کاوشِ بود و عدم کریں

دنیا کو پھر سے تازہ پیام حیات دیں

تاثیرِ قم باذنی، سے زندہ امم کریں

پھر داستان رَمَیْتَ رَمَا ہو آج
ینظر بنور اللہ، سے دل جام جم کریں

دل ہو طوافِ دوست میں اور کعبہ گرد دل
فتنے جگائیں عشق کے دیں پر کرم کریں

شانِ قلندری سے بڑھیں سوئے فتح باب
زاہد سے کام جو نہ ہوا آج ہم کریں

ذرّوں میں کائنات کے جلووں کا عکس ہو
قطرے کو موج موج کو ہمدوش یم کریں

الفقر فخری، سے کریں آرائش جنوں
دلدادگانِ عقل پر کوئی ستم کریں

ع